مظہر عباس*

وجودی کیفیات اور اردو ناول

Abstract:

The Dynamics of Existentialism and the Urdu Novel

Modern knowledge and science is believed to have rejected most traditional beliefs and concepts. Darwin, through his theory of evolution, presented man as an evolved version of the monkey. Freud turned human actions subservient to human sub-consciousness instead of consciousness. Marx rejected traditional concepts about capitalists, industrialists and the labor class, and introduced the concept of 'Dialectical Materialism'. The impact of all such points of view was felt directly and indirectly by religious ideologies. Where man used to think himself king of all creation, modern science trumped that notion, stealing from his intellectual pride. The consequent result of capitalism appeared before us in the form of market conflicts. As a result, the world bore the destruction caused by two world wars. All moral values were kept aside. The individual fled from objectivity and sought solace in subjectivity. Loneliness and alienation were destined to him. This article attempts to comprehend and analyze this condition as illustrated in the Urdu novel.

Keywords: Urdu novel, Alienation, Self-submission, Oppression, Dialectical Materialism.

مغائرت، بے گانگی، بے گھری کا احساس، اجنبیت اور تنہائی (alienation) وجودیت کے بڑےمباحث ہیں۔ جابر علی سید (۱۹۲۳ء۔ ۱۹۸۵ء) کے خیال میں جدید طرزِ احساس کی نمائندگی صرف ایک لفظ سے کی جا سکتی ہے 'تنہائی'___ یوں تو بیسویں صدی کا یہ ''خدا'' اپنا ایک بیٹا اور ایک روح القدس بھی رکھتا ہے یعنی شکستِ ذات اور لغو پرستی (absurdism) لیکن بڑے خدا کی طرح پرستش اسی کی ہوتی ہے[۱]۔ سی۔اے قادر (۱۹۰۹ء۔۱۹۸۷ء) تو تنہائی کو ہی وجودیت قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں وجودیت کا فلسفہ تنہائی اور بے گانگی یا غیریت کا فلسفہ ہے[۲]۔ انسان اپنے خارج سے فرار حاصل کرتا ہے تو اپنے داخل میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ بیسویں صدی کے انسان کے ساتھ یہی ہوا۔ تنہائی اور مغائرت اس کا نصیب ٹھہری۔ تنہائی اور مغائرت کو دو مختلف انداز میں پیش کیا گیا ہے:

۱۔ وجودی تنہائی

۲۔ مارکسی تنہائی

وجودی نقطۂ نظر یہ ہے کہ کوئی شخص زندگی کے کسی خاص لمحے میں نیستی اور وجودی موت جیسی کسی غیر معمولی اور انتہائی صورتِ حال سے دو چار ہو کر جب اپنی داخلیت میں پناہ تلاش کرتا ہے تو مغائرت، اجنبیت اور بے گانگی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس صورتِ حال کی وضاحت کے لیے ایک اقتباس دیکھیے:

> وہ اپنی اس مغائراتی کیفیت میں اس اضطراب میں گرفتار ہو جاتا ہے کہ اس کی فطرت بھی خارجی شے سے مماثلت نہیں رکھتی لہٰذا اس کی کیفیت لامکانی (homelessness) کی سی ہو جاتی ہے[۳]۔

وجودیت چوں کہ تمام اخلاقی، سماجی، معاشرتی اور مذہبی معیارات کو رَد کرتی ہے، فرد جب تمام سماجی معیارات اور اقتدار سے کٹتا ہے تو تنہائی اس کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ وہ اجنبیت اور مغائرت کا شکار ہو جاتا ہے۔ وجودیت کے تمام مکاتبِ فکر میں تنہائی اہم ترین موضوع ہے۔ یوں کہنا بہتر ہوگا کہ یہ انسان کی ازلی اور ناقابلِ تنسیخ صورت حال ہے۔ انسان فطری طور پر تنہا ہے۔ وہ اس دنیا میں تنہا آیا ہے اور اسے تنہا ہی اس دنیا سے جانا ہوگا۔ اس زندگی کے دورانیے میں کسی دوسرے سے اس کا تعلق مادی اور مفادی تو ہو سکتا ہے، لیکن فطری اور وجودی نہیں:

> انسانی معاشرہ ایسی بنجر اور بے آباد دنیا ہے جس میں راستہ دکھانے والی کوئی روشنی نہیں۔ انسان اس بے آب و گیاہ دنیا میں اپنے وجود کو کوئی معنی دینے سے قاصر ہے[۴]۔

جہاں تک مارکسی Alienation کا تعلق ہے، وہ داخل سے زیادہ خارج کی دنیا سے متعلق ہے۔ وجودی تنہائی

داخل سے خارج کی طرف جب کہ مارکسی تنہائی خارج سے داخل کی طرف سفر کرتی ہے۔ مارکسی تنہائی کا تعلق پیداواری مشینی نظام کے ساتھ ہے۔ انسان ایک خاص طرح کے مشینی معمولات میں زندگی گزارتا، اپنی ضروریات اور اخراجات کو پورا کرنے کی خاطر لگے بندھے ضابطے قبول کرتا ہے۔ یہ ضابطے اس کی آزادی کو ختم کرتے ہیں اور محنت کے ذریعے بنائی ہوئی اشیا کے ساتھ جذباتی وابستگی ختم کر دیتے ہیں۔ یعنی پیداوار اور انسانی محنت میں جذباتی وابستگی ختم ہوجاتی ہے۔ پیداوار کے ساتھ محنت کش کا تعلق ختم ہوجاتا ہے۔ پیداوار کو محنت کش کی بجائے کمپنی کے نام سے بیچا جاتا ہے۔ یوں انسان اپنے ہی بنائے ہوئے غیر انسانی ماحول کا شکار ہو کر فطرت، معاشرے اور انتہائی صورت میں اپنی ہی ذات سے مغائرت برتنے لگتا ہے۔اس حوالے سے ابن حسن کا نقطۂ نظر بہت اہم ہے:

> معاشیات میں یہ روپیہ ہی ہے جسے مارکس(Karl Marx،۱۸۱۸ء۔۱۸۸۳ء) زر کا تعلق cash nexus کہتا ہے جو انسان کے عمل پر حاوی ہے اور اسے کوئی شکل دیتا ہے۔ گویا کہ وہ کوئی شے ہو، جیتا جاگتا، زندہ، فعال اور باشعور انسان نہ ہو۔ مرکزی نقطہ یہ ہے کہ انسان کو خود اپنے ارتقا اور ترقی پر کوئی بس نہیں، یہ بس اَب خود اس کی بنائی ہوئی چیزوں کے قبضے میں ہے [۵]۔

دونوں نقطہ ہائے نظر پر غور کریں تو اجنبیت ،مغائرت، تنہائی، بے گھری اور فرار کے اس احساس کی وجوہات خارجی ہیں۔ خارج سے فرار کے نتیجے میں مغائرت اور تنہائی کو وجودیت زیرِ بحث لائی اور اپنی محنت اور اپنی بنائی ہوئی اشیا کے ہاتھوں اپنی شناخت کے گم ہونے کے عمل کو مارکسزم زیرِ بحث لایا۔اُردو ناول میں تنہائی کے یہ دونوں رنگ بہت گہرے نظر آتے ہیں۔ وجودیت کے زیرِ اثر جن ناول نگاروں کے ہاں مغائرت اور تنہائی کے رنگ نظر آتے ہیں ان میں قرۃ العین حیدر(۱۹۲۷ء۔ ۲۰۰۷ء)،عبداللہ حسین (۱۹۳۱ء۔ ۲۰۱۵ء) اور انیس ناگی (۱۹۳۹ء۔ ۲۰۱۰ء) کے نام بہت اہم ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے زیادہ تر کردار وں کا تعلق اودھ کی مٹتی ہوئی تہذیب سے ہے۔ اگرچہ قرۃ العین حیدر تک آتے آتے یہ تہذیب اپنے منطقی انجام کو پہنچ چکی تھی تاہم اِس تہذیب کی باقیات اتنی دل فریب تھیں کہ وہ اس تہذیب کی نوحہ خواں بن گئیں۔ یہ تہذیب اپنی وضع داری، جاہ و جلال اور تمدنی صورتِ حال کے ساتھ قائم تھی۔ اگرچہ اس وقت تک بڑے شہروں میں کاروباری طرزِ زندگی، دولت کی نمود و نمائش،تحرک اور تبدیلی کی فضا جنم لے چکی تھی لیکن اُس وقت تک لکھنؤ کی تہذیب آخری سانسیں لینے کے باوجود اپنی روایات اور وضع داری کی ڈگر پر قائم تھی۔ بڑے شہروں کی طرح یہاں نو دولتیا پن ابھی تک نہیں آیا تھا۔قرۃ العین حیدر نے اس وضع دارانہ تہذیب کو ختم ہوتے بھی دیکھا، تقسیمِ ہندوستان، ہجرت اور فسادات کے منظر نامے کو بھی دیکھا اور اُس کی مرثیہ خواں بن گئیں۔

قرۃ العین حیدر نے اس تہذیبی وقار، رکھ رکھاؤ، مذہبی رواداری، عدم تعصب کی روایت میں شعور کی آنکھ کھولی۔ والد کی موت، تقسیم ہندوستان اور اس کے نتیجے میں پوری سماجی ڈھانچے کا انہدام ایسے عوامل ہیں جو قرۃ العین حیدر کے ناولوں کا تخلیقی تجربہ بنے۔ قرۃ العین حیدر کے سبھی کردار وقت کے آگے بے بس ہیں، موت جیسے فینومینا (phenomenon) کو سمجھ نہیں پاتے اور فنا کے خوف کا شکار ہیں۔ سماج میں آنے والی تبدیلی (تقسیم ہندوستان اور اس کے عواقب) کو روکنے سے قاصر ہیں۔ ہزاروں سال سے قائم ہند اسلامی تہذیب کی رواداری، بھائی چارہ اور عدم تعصب کو ختم ہوتے دیکھ رہے ہیں، بے بس ہیں۔ یہ سب حالات ان کرداروں میں مغائرت، مایوسی، افسردگی، قنوطیت اور تنہائی کو جنم دے رہے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے پہلے دو ناولوں کے زیادہ تر کردار اسی مغائرت اور تنہائی کا شکار ہیں۔

میرے بھی صنم خانے (۱۹۴۹ء) کا علامتی عنوان واقعات، کرداروں کے رویے اور بیان کے نئے پن کی بدولت گہری معنویت کا حامل ہو جاتا ہے۔ ناول کے سبھی کرداروں کا تعلق اودھ کی مخصوص تہذیب سے ہے۔ قرۃ العین حیدر بھی انھی کرداروں کے درمیان رہی تھیں۔ اس لیے کرداروں کی مؤثر تصویر کشی کی گئی ہے۔ ناول کے سبھی کردار موسیو وولے، شہلا رحمن لالہ اقبال نرائن، مس عرفان علی روشی (رخشندہ)، پیچو (پولیس آفیسر)، پولو، کرن، سلطنت آرا بیگم، کنور عرفان علی خان، کرسٹابل حفیظ احمد، ڈائمنڈ، ڈون انور، ول کمار چٹو پادھائے، نواب سلیمان قدر، کوئین روز، جہانگیر قدر، گنی وغیرہ، ہر قسم کے مذہبی تعصب سے بالا، انسان دوست اور انسانیت کے علم بردار ہیں لیکن جب وہ فرقہ وارانہ مذہبی فسادات میں انسانیت اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کو مٹتا دیکھتے ہیں تو مغائرت اور تنہائی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اوشیر لہری کی خود کلامی سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ___ انسان جیتے ہیں اور مرتے ہیں، دل ٹوٹتے ہیں اور جڑتے ہیں کسی کو موت آتی ہے، کسی کو نہیں آتی۔ نیند بھی نہیں آتی۔ یہ چکر یونہی چلتا رہے گا سب انشچِت ہیں، سب دُکھی ہیں[۶] ___

کنور عرفان علی خان مٹتے ہوئے جاگیردارانہ سماج کی نمائندگی کر رہا ہے اور رخشندہ نئے آنے والے سرمایہ دارانہ نظام کی داعی ہے۔ ناول میں جہاں روشن خیال، قوم پرست اور آزادی کے متوالے کردار ہیں تو وہاں پر ایسے قدامت پرست تعلقہ دار بھی موجود ہیں جو برطانوی سامراج کے خیرخواہ ہیں کیوں کہ ان کے جاگیردارانہ نظام کی بقا انگریزوں کی حکومت کے ساتھ جڑی ہے۔ ناول نگار نے اودھ کی تہذیب لیے جذباتی وابستگی دکھائی ہے تو دوسری طرف اس تہذیب، تصنع اور کھوکھلے پن پر طنز بھی کیا ہے۔ ناول کے کرداروں میں موجود مغائرت، تنہائی اور فراری کیفیات کے حوالے سے مختصر اقتباس ملاحظ ہو:

> وہ دن بھر سہ دری میں بیٹھی کتابیں پڑھا کرتی، یا نٹنگ کرتی رہتی۔ وہ اپنے چاروں طرف کے منظر دیکھتی اور اسے وجود کی اس شدید بے کیفی، انتہائی اُکتاہٹ کا احساس ہوتا۔ دھندلکے میں چھپے ہوئے، لیمپ، کچی

مظہر عباس

۱۴۴

> سڑکوں، راستوں کی گہری کیچڑ، لہنگوں اور برقعوں والی عورتوں کی قطاریں، سائیکل، یکے، چھوٹے چھوٹے غیر ضروری انسان، ان کے سگرٹوں کا اُٹھتا ہوا دھواں ـــــ ایک صبح ایک دوسرے کو مار کوختم کر دیں گے اور گِدھ آئیں گے[۷]۔

مغائرت، تنہائی اور فرار کی شدید صورت قرۃ العین حیدر کے دوسرے ناول سفینۂ غمِ دل (۱۹۵۲ء) کے کرداروں میں بھی نظر آتی ہے۔ ناول کا زمانی دورانیہ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۵۰ء تک کا ہے۔ یہ دور سیاسی گہما گہمی، تعصّبات، ہجرت اور فسادات کے حوالے سے مشہور ہے۔تقسیم ہندوستان کے نتیجے میں مذہبی تعصّبات شدت کے ساتھ ابھر کر سامنے آئے۔ اس لیے اس ناول میں بکھرے ہوئے خاندان ، اجڑے ہوئے شہر، درندوں میں تبدیل ہوتے انسان، سفاکی میں تبدیل ہوتی انسانیت، شرم ناک واقعات اور قتل و غارت نے بیشتر کرداروں کو اعصاب شکن صورتِ حال کا شکار کردیا ہے۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ناول کے سبھی کردار ایلمر، علی، ارون، اسٹیلا، میرانلنی اور متکلم (جو کہ قرۃ العین خود ہیں) سب کردار وجودی مغائرت، تنہائی اور افسردگی کا شکار ہیں۔ یہ سب کردار مختلف مذاہب سے تعلق ہونے کے باوجود ایک جان اور کئی قالب تھے۔ وقت کے جبر کے ہاتھوں ایک دوسرے سے دور ہوئے، ایک دوسرے کے دشمن بنے۔ ایلمر نے تاجِ برطانیہ کے استحکام کی خاطر علی پر گولی چلائی۔تہذیبی وضع داری کے باوجود ہندو ،مسلمان کی تقسیم اور شناخت پوری شدت کے ساتھ سامنے آئی۔ یہ سب کردار ہند اسلامی تہذیب کے خاتمے اور اودھ کی وضع دار تہذیب کی شکست و ریخت کو دانش ورانہ سطح پر دیکھ رہے ہیں، محسوس کر رہے ہیں اور بے بس ہیں۔ یہ بے بسی ان میں مغائرت ،تنہائی اورفراری کیفیات کوجنم دے رہی ہے۔اس لیے اوشیرلہری خود سے کہتا ہے:

> میں اکیلا ہوں۔ میں بالکل اکیلا ہوں۔اور وہ طوفان زدہ سمندروں کے پرے چلی گئی ہے۔ زمین چاند کے کٹہرے میں نیلی نظر آرہی ہے۔ہمارے رونے کی آواز سن کر جنوب میں چلنے والی ہوائیں تھم گئی ہیں[۸]۔

ریاض کی مغائرت اورتنہائی کی جھلک اِس اقتباس میں ملاحظہ ہو:

> اس کے ذہن پر سے دھندلکا رفتہ رفتہ بالکل چھٹ گیا۔ دل و دماغ کے غرور کی یہ شکست کس نے دیکھی ہے۔ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ میں تنہا ہوں۔ میں آخر کار تنہا ہوں اور میں نے خود کو اپنے دماغ کے غرور میں پھر سے محصور کر لیا ہے۔ میں محفوظ ہوں۔ میں اپنی دنیا، اپنے وجود کی کائنات میں واپس آ گیا ہوں[۹]۔

ناول کے سبھی کردار آخر تک مغائرت اور تنہائی کا شکار رہتے ہیں۔ ایلمر پچیس برس ہندوستان میں رہا۔ میرانلنی سے عشق کیا۔ ناکام اور تنہا واپس برطانیہ چلا گیا۔ میرانلنی ،لندن، پیرس، واشنگٹن،غرض دنیا بھر میں پھرتی رہی لیکن تنہائی اس کا بھی مقدر ٹھہری۔ ارون، علی سب اس تنہائی اور مغائرت کا شکار رہے۔ ریاض نے شادی کر لی لیکن کیا شادی اور بچے اس کی

اندر کی تنہائی کو دور کر سکے؟ قرۃ العین حیدر اپنے کرداروں کی تنہائی کے حوالے سے خود کہتی ہیں:

> تنہائی ایک مسئلہ بھی ہے اور موضوع بھی۔ ہر ادیب لکھتے ہوئے تنہا ہی ہوتا ہے۔ البتہ مغرب کے ادیب کی تنہائی کے ساتھ ایک سماجیاتی تناظر بھی ہے[۱۰]۔

عبداللہ حسین کے ناول **باگھ** (۱۹۸۲ء) کو وہ پذیرائی حاصل نہیں ہوئی جو ان کے ناول **اُداس نسلیں** (۱۹۶۳ء) اور **نادار لوگ** (۱۹۹۶ء) کو حاصل ہوئی۔ اس کی ایک بنیادی وجہ ناول کے کینوس(canvas) کا محدود ہونا ہے۔ لیکن **باگھ** وجودی فکر اور خاص طور پر مغائرت اور تنہائی کے حوالے سے بہت اہم ناول ہے۔ ناول کا عنوان **باگھ** علامتی نوعیت کا حامل ہے۔ یہ فوجی آمروں کی علامت ہے جو خوف اور دہشت کی فضا تخلیق کر کے اپنے اقتدار کو طول دیتے ہیں۔ ناول کا مرکزی کردار ''اسد'' جبر کی وجہ سے مغائرت اور تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے۔ پہلی بار جبر کا احساس اسے حکیم کے زیرِ علاج رہ کر ہوتا ہے۔ حکیم اسے روز دوائی دیتا ہے تاکہ وہ چلا نہ جائے۔ یوں ایک فرد دوسرے فرد کے جبر کا شکار ہوتا ہے۔ وہیں اسد کو حکیم کی بیٹی یاسمین سے محبت ہو جاتی ہے۔ دوسری بار جبر کا شکار وہ اس وقت ہوتا ہے جب حکیم قتل ہو جاتا ہے اور اسد قتل کے الزام میں گرفتار ہو کر جیل کی تنگ و تاریک فضا میں غیر انسانی تشدد کا شکار ہوتا ہے۔ وہ بے گناہ ہو کر بھی اپنی بے گناہی کا یقین نہیں دلا سکتا اور لغویت اور مغائرت کا شکار ہوجاتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> کیا واقعی میرا کوئی وجود نہیں، جھوٹ اور سچ کی اصلیت کیا ہے؟ میرا سچ ان کا جھوٹ ہے، ان کا سچ میرا جھوٹ۔ کوئی پوچھنے والا نہیں؟ کیوں؟ یہ روٹی اس اندھیرے میں مجھے نظر بھی نہیں آرہی، مگر یہ ہاتھ میں پکڑی ہے اور میں اسے کھا رہا ہوں____ اگر میرا وجود نہیں ہے تو تشدد کس پر کیا جارہا ہے[۱۱]۔

ناول کی کہانی تین مختلف حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ پہلی کہانی اسد اور یاسمین کی محبت، دوسری میں اسد کا بلاجواز جیل جانا اور تیسری کہانی میں کشمیر میں فوجیوں کی مدد اور گوریلا کارروائیوں کو پیش کیا گیا ہے۔ اگرچہ ناقدین ان تینوں حصوں کو غیرمربوط قرار دیتے ہیں لیکن اسد کا کردار اس کی تنہائی، اَنا کی قید، بے خانمانی کی قید ہے اور سب سے زیادہ زندگی کے لاینحل مسائل کی قید ہے۔

اُردو ناول کی روایت میں انیس ناگی کا نام اس حوالے سے انفرادیت کا حامل ہے کہ انھوں نے ''وجودیت'' کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ ان کی شاعری، افسانے اور ناول وجودی فلسفے کی گہری چھاپ لیے ہوئے ہیں۔ مغربی ادب کے گہرے مطالعے اور کتاب کی مسلسل صحبت نے انیس ناگی کو وجودی فکر کا تحفہ دیا۔ انیس ناگی کے ناول اور دیگر تخلیقات ثابت کرتی ہیں کہ وہ کیئر کیگارڈ(Soren Aabye Kierkegaard_۱۸۱۳ء_۱۸۵۵ء)، سارتر(Jean-Paul Sartre_۱۹۰۵ء_ ۱۹۸۰ء) کامیو(Albert

Camus ۔۱۹۱۳ء۔۱۹۶۰ء) اور دیگر وجودی مفکرین اور تخلیق کاروں سے بہت متاثر ہوئے۔ ان کی زندگی اور رویوں پر وجودیت کی گہری چھاپ تھی اور اس کی عکاسی ان کے ناولوں میں نظر آتی ہے۔ انیس ناگی اُردو ناول کی روایت میں واحد ناول نگار ہیں جنھوں نے فلسفۂ وجودیت کو بنیاد بنا کر ناول تخلیق کیے۔ناول زندگی کی وسیع کینوس(canvas) پر عکاسی کرتا ہے۔ ہر ناول زندگی کے کسی نئے بُعد، نئے تجربے، نئے طرزِ احساس کا اظہار بن کر سامنے آتا ہے۔ یہ نیا تجربہ، نیا احساس درحقیقت ناول نگار کے ذاتی تجربات سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ اسے ناول نگار کی زندگی کا ذاتی تجربہ اور عکس قرار دیا جاسکتا ہے:

> زندگی جو ناول میں پیش کی جاتی ہے وہ اپنی جگہ اہمیت ضرور رکھتی ہے مگر خود مصنف کی شخصیت اس تجربے سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے [۱۲]۔

دیوار کے پیچھے (۱۹۸۳ء) انیس ناگی کا پہلا ناول ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار ایک پروفیسر ہے۔ پروفیسر سچائی، اعلیٰ اخلاقی اقدار اور آزادی کے ساتھ اپنی زندگی گزارنا چاہتا ہے لیکن جس سماج میں وہ رہ رہا ہے، وہ ان اقدار کو نہیں مانتا کیوں کہ یہ سماج غیر جمہوری، غیر منصفانہ، جھوٹ، فریب اور بے ایمانی پر قائم ہے۔ پروفیسر اس سماج کی منافقت، فریب، دوہرے معیارات، تصنع اور مکاری کا پردہ چاک کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن حالات کے آگے لاچار اور بے بس ہو جاتا ہے۔ اس لیے وہ مغائرت اور تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے۔ پروفیسر سچ بولتا ہے لیکن اس کے اِردگرد موجود کرداروں کو یہ سچ برداشت نہیں ہوتا کیوں کہ اکثریت حق گوئی سے گریز کرتی ہے۔ پروفیسر کے خاندان کے افراد بھی اس کے سچ کو برداشت نہیں کرتے۔ اس سچ گوئی کی بدولت اس کی بہن کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے۔ ان حالات سے مایوس ہو کر وہ خودکشی کی کوشش کرتا ہے لیکن ناکام ہوتا ہے اور آخر کار وہ لاپتا ہو جاتا ہے لیکن اپنی کہانی لکھ کر چھوڑ جاتا ہے۔ پروفیسر کے کرب ذات، مغائرت اور تنہائی کو سمجھنے کے لیے درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

> کیا مجھے اس تھوکی ہوئی زندگی کو پھر چاٹنا ہے؟ مجھے آرام کا مشورہ دیا گیا ہے؟ میں نے اپنے فیصلے کا اعلان کرنے سے پہلے اپنی تنہائی اور بے زاری سے تنگ آ کر اپنی مکروہ سوانح عمری کو لفظوں میں منتقل کیا ہے، ایک مرتبہ پھر لاتعلق ہونے سے قبل یہ احمد کے حوالے کردوں گا، کیوں کہ ان کے جملہ حقوق محفوظ ہیں [۱۳]۔

مغائرت اور تنہائی کا گہرا رنگ انیس ناگی کے دوسرے ناول میں اور وہ (۱۹۸۴ء) کے مرکزی کردار میں نظر آتا ہے۔ میں اور وہ کا مرکزی کردار اپنی ہی ذات کے دو حصوں سے ہم کلام ہے۔ یہ ہم کلامی بیانیہ اسلوب میں ہے جس میں فلسفیانہ گہرائی، سارتر اور کامیو کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ انیس ناگی نے ناول کے مرکزی کردار کو بین الاقوامی تناظر میں پیش کیا ہے۔ مرکزی کردار جبر، تنہائی اور معاشی بدحالی کا شکار ہو کر انقلابی عرب ملک میں چلا جاتا ہے۔ وہاں کی زندگی سے بھی مطمئن

نہیں ہوتا۔ پردیس میں منافقت، ریاکاری اور بے حسی پر وہ داخلی شکست و ریخت کا شکار ہو جاتا ہے۔ وطن آپس آتا ہے تو اس کے خلاف غیر قانونی طور پر ملازمت سے غیر حاضری کی بنا پر کارروائی شروع ہو جاتی ہے۔ وہ منظر سے غائب ہو جاتا ہے اور ایک فلیٹ میں چھپ جاتا ہے۔ اس کی یہ تنہائی اور خوف اسے اندر ہی اندر ختم کرتا جاتا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> تنہائی میں سوچ جنم لیتی ہے یا پھر سوچ تنہائی کو جنم دیتی ہے۔ تنہائی اور سوچ کے تانے بانے سے بہت سے منصوبے بنتے لیکن سب کے سب ادھورے رہتے۔ میں نے تنہائی کو موردِ الزام ٹھہرایا۔ پھر سوچ کو ملامت کی کہ اس نے ارادے کو نحیف کر دیا ہے"[۱۴]۔

۲۰۰۵ء میں انیس ناگی کے چار ناولوں کا مجموعہ فصیلیں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں شامل ناول چوہوں کی کہانی کا مرکزی کردار ''میں'' بھی اپنے ملک کی حدود سے باہر نکلتا ہے۔ پہلی مرتبہ وہ الجزائر جاتا ہے اور دوسری مرتبہ ہندوستان کے شہر سورت جاتا ہے جہاں طاعون کی وَبا کے جراثیم لانے کے جرم میں قید کر دیا جاتا ہے۔ واپس آتا ہے تو چھٹی منظور کرائے بغیر ملک چھوڑنے کے الزام میں قید کر دیا جاتا ہے۔ اِس کردار کے ذریعے ناول نگار نے دیگر ممالک اور وہاں کے حالات کو پیش کیا ہے۔ یوں یہ کردار میں اور وہ کے مرکزی کردار سے مماثلت رکھتا ہے۔ ملک واپسی پر اس کے خلاف بھی کارروائی ہوئی اور وہ چھپ گیا، جب کہ چوہوں کی کہانی کا ''میں'' قیدی کی حیثیت سے وطن آیا اور یہاں کے سیکورٹی اداروں نے اپنی قید میں رکھا اور اس پر جاسوسی کا شبہ بھی کیا گیا۔ یہ کردار بھی تنہائی اور مغائرت کا شکار ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> مجھے کوئی ملنے نہیں آتا جو مجھے تنہائی سے باہر نکال سکے۔ پہلے میں اس تنہائی میں رنجیدہ تھا، میں کافی سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تنہائی ہر انسان کا مقدر ہے۔ اس احساس کے ساتھ تنہائی کی چبھن کچھ کم ہوگئی ہے[۱۵]۔

انیس ناگی کے ناول قلعہ (۲۰۰۵ء) کا بنیادی کردار دارا بھی خارجی حالات کے ہاتھوں مغائرت اور شدید تنہائی کا شکار ہوتا ہے۔ کم عمری میں والد کی طرف سے جبر کا شکار ہوا۔ وہ جبراً دارا سے اپنے فیصلے منواتے۔ بار بار احساس دلاتے کہ اس کی اپنی ذات کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس کی زندگی کے سبھی فیصلے وہ کریں گے۔ اس کم مائگی نے دارا کے اندر مزاحمت کی بنیاد رکھی۔ اس نے کتاب میں پناہ تلاش کی۔ اس کی کتب بینی پر بھی اس کے والد کو سخت اعتراض تھا۔ والد کے اِس رویے نے اس کے اندر احتجاج کی بنیاد رکھی۔ کتب سے محبت نے اس کے اندر جھوٹ، منافقت، ریاکاری اور بے ایمانی کے خلاف ڈٹ جانے کی ہمت پیدا کی۔ دارا نے مزاحمت کے ذریعے خود کو مصدقہ وجود (authentic existence) ثابت کیا ہے۔ دارا نے اس

سسٹم کا مقابلہ کیا لیکن اس کے بدلے میں اسے شدید تنہائی اور مغائرت کا سامنا کرنا پڑا۔ ''قلعہ'' علامت ہے پناہ کی، اَمن کی، سکون کی لیکن یہ قلعہ ہمارے سماج اور اس میں مروج نظام کا عکاس بن رہا ہے اور بالکل اُلٹ معنی اختیار کیے ہوئے ہے۔ ناول میں ہمارے ملک میں پھیلتی بدعنوانی اور بدعنوان نظام کی عکاسی کی گئی ہے۔ کبھی دھونس، کبھی دھمکی، کبھی لالچ تو کبھی دوستی کے نام پر دارا سے مفاد حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔ جتنا زیادہ زور ڈالا گیا بظاہر وہ اتنا ہی مضبوط ہوتا گیا، لیکن اس کے اندر کش مکش جاری رہی۔ وہ تذبذب کا شکار تھا وہ کچھ فیصلے کرنا چاہتا تھا جو اس کی زندگی میں انقلاب برپا کر سکتے تھے۔ لیکن حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر وہ انتخاب سے گریز کر جاتا۔ اس گریز سے بتدریج اس میں تبدیل آنے لگی تھی[۲۲]۔ اس کش مکش کے ذریعے دارا کی خارجی اور داخلی صورتِ حال کی عکاسی کی گئی ہے۔ دارا ان نظریات کے حامل لوگوں کو تو غلط ثابت نہ کر سکا کیوں کہ پورا نظام انھی دو رویوں سے گُندھا ہوا ہے۔ البتہ مغائرت اور تنہائی ضرور اس کا مقدر بنی۔ ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑے۔ یہاں دارا کی شکل میں انیس ناگی نظر آ رہا ہے جو ہمیشہ ہی اس نوکر شاہی نظام میں ناپسندیدہ کردار رہا۔

مغائرت اور تنہائی کا شدید احساس ریٹائرڈ میجر قربان علی کے کردار پر نظر آتا ہے۔ میجر قربان علی، انیس ناگی کے ناول کیمپ (۲۰۰۵ء) کا مرکزی کردار ہے۔ کیمپ اپنی نوعیت کا منفرد ناول ہے۔ اُردو ناول کی روایت میں افغان مہاجرین کے موضوع پر یہ واحد ناول ہے۔ اس ناول میں انیس ناگی نے افغانستان کی حالات سے زیادہ افغان مہاجرین کی پاکستان آمد، ان کے معاشرتی اور معاشی حالات، ان کی غیر قانونی سرگرمیاں، ہمارے حکمرانوں کی کم فہمی کو افغان مہاجرین کے کیمپ کے تناظر میں پیش کیا ہے۔ میجر قربان کی مغائرت اور تنہائی کو سمجھنے کے لیے اس کردار پر نظر ڈالتے ہیں۔ میجر قربان ایک عام سا آدمی تھا جس کا زندگی کا کوئی واضح تصور نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس کے زندگی کے بارے میں کچھ خواب تھے لیکن ان خوابوں کو پورا کرنے کے لیے جن وسائل کی ضرورت تھی، وہ اس کے خاندان کے پاس نہیں تھے۔ اُس نے فوج میں کمیشن لے لیا کہ شاید اِس طرح اُس کے خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکیں۔ لیکن یہاں آ کر بھی اس کے ماضی کی تنہائی اور مزاج کی داخلیت برقرار رہی:

> ..... وہ خوش تھا اور نہ ناخوش، اسے زندگی بسر کرنا تھی۔ اپنے یونٹ میں بھی اس کی میل ملاقات چند افسروں تک محدود تھی۔ اس کی بات چیت اور تعلقات بلیرڈ روم (billiard room) تک ہی تھے۔ یہ زندگی کو بسر کرنے کا ایک مشکل انداز تھا لیکن میجر قربان نے اپنی تنہائی کو کسی نہ کسی طرح آباد کر لیا تھا[۱۶]۔

میجر قربان شادی کر لیتا ہے۔ اس کی رجمنٹ کو سابقہ مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) بھیج دیا جاتا ہے۔ ہنگاموں میں وہ اپنی رجمنٹ کے ساتھ بہادری سے مکتی باہنی اور ہندوستانی فوجوں سے مقابلہ کرتا ہے۔ لیکن فوج نے ہتھیار ڈال دیے اور وہ

گرفتار ہو گیا۔ اس کی بیوی ان ہنگاموں میں لاپتا ہو گئی۔ رانچی کے کیمپ میں دوسرے فوجیوں کے ہمراہ میجر قربان کے ساتھ جو سلوک کیا گیا ان کے مقابلے میں نازی رحم دل لگتے تھے۔ قید سے رہائی کے بعد اسے سبک دوش کر کے ایک سول محکمے میں ملازمت دے دی گئی۔ وہ سارا دن دفتر میں بیٹھا اپنے سامنے ایک سفید دیوار کو مسلسل گھورتا رہتا، وہ کچھ نہ سوچتا اور نہ کچھ بولتا۔ اسے یہ آزادی چبھنے لگی تھی۔

سول محکمے سے اس کو افغان مہاجرین کیمپ کا انچارج بنا کر بھیج دیا گیا، جہاں اس کی داخلی تنہائی خارجی حالات کی بدولت اس حد تک بڑھ گئی کہ وہ جان کی پروا کیے بغیر کیمپ سے نکل کھڑا ہوا۔ یوں میجر قربان نے ایک بے مقصد، لایعنی اور لغو زندگی سے فرار حاصل کیا اور موت کو گلے لگالیا۔ جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے کہ انیس ناگی ایک وجودی تخلیق کار ہیں۔ ان کے تقریباً تمام ناولوں کے مرکزی کردار شدید قسم کی تنہائی کا شکار ہیں۔ اس مغائرت اور احساسِ تنہائی کی بنیادی وجہ ناول نگار کی وجودی فکر سے وابستگی ہے۔ وجودی فلسفیوں کا نقطۂ نظر ہے کہ انسان کو ہر وقت تنہائی کا احساس رہتا ہے وہ اپنے آپ کو دنیا میں بے سہارا اور تنہا سمجھتا ہے۔

مشرف عالم ذوقی (۱۹۶۲ء) کا ناول پوکے مان کی دنیا (۲۰۰۴ء) موضوع کے نئے پن اور بیان کی ندرت کے حوالے سے اُردو ناول کی روایت میں منفرد مقام کا حامل ہے۔ ناول میں گلوبلائزیشن (globalization) اور اس کے منفی اثرات کو نئی نسل کے حوالے سے موضوع بنایا گیا ہے۔ نئی نسل اور پرانی نسل کے درمیان بڑھتے فاصلے اور ان کے نتائج بھی زیرِ بحث لائے گئے ہیں۔ اس ناول کا مرکزی کردار سنیل کمار رائے ایک جج ہے۔ جس کا تعلق بہار کے ایک شہر گوپال گنج سے ہے۔ محنت کے بل بوتے پر ترقی کرتے کرتے وہ جج بنا اور دلی کی ریگل سٹریٹ (Regal Street) کے ایک خوب صورت بنگلے تک پہنچ گیا۔ لیکن اپنے ماضی سے پیچھا نہ چھڑا سکا۔ جج ہونے کی حیثیت سے اس نے خود پر جو پابندیاں لگائیں، وہ انھی میں قید ہو کر رہ گیا۔ سنیل کمار اپنے وجود کا احساس دلانے کی کوشش کرتا ہے لیکن اسے دقیانوسی (old-fashioned) کہہ کر اس کے بچے اور بیوی اسے قید خانے میں واپس دھکیل دیتے ہیں جسے جیل (lock-up) کا نام دیا گیا ہے۔ عالمگیریت کے اثرات کی حامل نئی اخلاقیات کو وہ قبول نہیں کر سکتا۔ اپنے بیٹے اور بیٹی کے دوستوں کی آزادانہ آمدورفت، فیشن کے نام پر چست اور مختصر ترین لباس اسے برداشت نہیں ہوتے مگر وہ ان کو برداشت کرنے پر مجبور ہے۔ نتیجتاً وہ شدید قسم کی مغائرت اور تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> یہ جنریشن گیپ (generation gap) ___ آپ کے اور ہمارے بیچ کا ڈیڈ (dad) ___ اونلی (only) جنریشن گیپ۔ آپ صرف ہماری جنریشن میں بیکٹیریا (bacteria) ڈھونڈو گے۔ غلط باتوں کا بیکٹیریا۔ یو آر سو کنز رویٹو

> اینڈ سواولڈ فیشنڈ (you are so conservative and so old-fashioned)___بدلے ہوئے زمانے میں آپ کبھی ہمیں ایکسیپٹ (accept) نہیں کرو گے[۱۷]۔

اَب ہم مارکسی تنہائی کی طرف آتے ہیں اور اُردو ناول پر اس فکر کے اثرات کا جائزہ لیتے ہیں۔ مارکسی تنہائی کی بحث ہم پہلے کر آئے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جدید سرمایہ دارانہ نظام میں انسان کی اپنی شناخت اس کی محنت اور اپنی بنائی ہوئی اشیا کے ہاتھوں گم ہو جاتی ہے۔ اس کی قسمت مارکیٹ (market) کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ انسان کو اپنے ارتقا اور ترقی پر کوئی اختیار نہیں، یہ اختیار اس کی بنائی ہوئی اشیا کی مارکیٹ ویلیو (market value) سے جڑا ہے۔ نتیجتاً اس کی روحانی تشفی نہیں ہوتی۔ اسے اپنی شناخت کے مسخ ہونے کا شدید احساس ہوتا ہے، وہ فطرت، معاشرے اور خود اپنی ذات سے مغائرت کا شکار ہو جاتا ہے۔ مارکسی تنہائی کا زیادہ تر تعلق صنعتی سماج سے ہے۔ ہمارے ہاں صنعت کاری کا عمل اس طرح نہیں ہوا جس طرح یورپی سماج میں ہوا۔ نتیجتاً ہم دیکھتے ہیں کہ اُردو ناول میں اس طرح مارکسی تنہائی کے اثرات نہیں، جس طرح مغرب کے ناول میں نظر آتے ہیں۔ اُردو ناول میں کہیں کہیں ان اثرات کو کسی کردار کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔ مارکسی مغائرت کا ایک اور رُخ طبقاتی نظام کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ سماج میں موجود مراعات یافتہ طبقہ سرمایہ، پیداواری نظام، طاقت اور اختیار پر قابض ہو کر محروم طبقے کو حاشیے پر دھکیل دیتا ہے۔ جس سے محروم طبقے میں تنہائی کا عمل شروع ہوتا ہے۔ وہ سماج میں موجود سیاسی، سماجی اور فکری دھارے سے کٹ کر اپنی بنیادی ضروریات کے حصول تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس طبقے کا انسان ایک سطح پر اپنی ذات سے بھی مغائرت برتنے لگتا ہے۔

مارکسیت تنہائی کی بہت موثر اور بھرپور عکاسی عبداللہ حسین کے ناول اُداس نسلیں (۱۹۶۳ء) میں کی گئی ہے۔ تقسیم سے پہلے ہندوستان کے زرعی سماج سے وابستہ افراد جاگیرداروں کی جبری مشقت، مستاجری کے مسائل اور خشک سالی سے تنگ آ کر کارخانوں میں ملازم ہوئے۔ مشینی اوقات کار اور مشینوں کے ساتھ کام کرتے کرتے انسان کس طرح مشین میں ڈھلتے ہیں، اس کے لیے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> روح کی وہ نکھراہٹ اور تروتازگی جو انسانی زندگی میں قوت اور سکون پیدا کرتی ہے، جو محنت کرنے والوں کو اطمینان بخشتی ہے؟ روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی چیزیں جو خوشی دیتی ہیں جو نہایت اہم ہیں۔ روز روز کے مقابلے، لڑائی جھگڑے، کبھی کبھی کے میلے، تہوار، دوست، دشمنی، ہولی، دیوالی..... پیچھے رہ گئی تھیں[۱۸]۔

اِن مزدور کسانوں کی تنہائی اور مغائرت کی عکاسی ناول کے مرکزی کردار نعیم کے سوتیلے بھائی کے ذریعے کی گئی ہے۔ علی، نعیم کا چھوٹا بھائی ہے۔ سوتیلے پن کا احساس، نعیم کی معاشی آسودگی اور نوجوانی کے جذبات نے اسے خودسر، بدتمیز بنا

دیا تھا۔ نعیم اسے شہر میں ایک کپڑے بنانے کی مل میں مزدور بھرتی کرا جاتا ہے۔ وہاں علی گاؤں کی آزادی سے کٹ کر مشینی زندگی، مشینی اوقات کار کی بدولت ایک قیدی کی سی کیفیات کا شکار ہو جاتا ہے۔ صنعتی سماج کی یہ زندگی مزدوروں کے ساتھ ساتھ وہاں کام کرنے والے نوجوان افسروں کی زندگی کو بھی اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ رہی تھی۔ انھوں نے علم دوستی کا ثبوت دینے کے لیے اپنے گھروں میں کتابیں سجائی ہوئی تھیں۔ ان کتابوں کی اندرونی حالت خستہ ہو چکی تھی۔ دیمک انھیں اندر سے آہستہ آہستہ چاٹ رہی تھی۔ یہ کتابیں ان نوجوانوں کی طرح اندر سے کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ یہ اتفاق تھا کہ ان نوجوانوں اور ان کی کتابوں کے وجود میں دردناک حد تک مشابہت تھی۔ کچھ ہی عرصے بعد علی اپنی عمر سے کہیں بڑا اور بیمار نظر آنے لگا۔ اس زندگی کو گزارتے گزارتے وہ اپنے وجود کے ساتھ مغائرت برتنے لگا۔ اسے بھوک کم لگتی، اس کی خوراک نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ خوراک کی کمی کی بڑی وجہ آمدنی کی قلت بھی تھی۔ اپنی آمدنی کے ساتھ وہ صرف دو وقت کی روٹی پوری کر سکتا تھا۔ مغائرت، تنہائی اور بے گھر ہونے کا احساس شدید ہوتا گیا۔ اسے ایک عجیب وغریب خیال آیا:

> کہ جیسے وہ اُکھڑے ہوئے نوجوان درختوں کے سائے میں ستا رہا ہے اور درخت روز بروز خشک ہوتے جا رہے ہیں[19]۔

اس کی زندگی اور رویے میں یکسانی، بوریت، میکانکی اور مشینی انداز در آیا۔ وہ مشینی انداز میں کھانا کھاتا، اپنی بیوی کے ساتھ ہم بستری کرتا۔ کوئی یہ کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ وہی پرانا، گاؤں کا باسی، علی ہے۔ صنعتی سماج کے زیرِ اثر انسان کی شخصیت میں رونما ہونے والی اس تبدیلی کے حوالے سے ایک اقتباس دیکھیے:

> بُعد کا احساس اپنی شدت کے ساتھ اس وقت آتا ہے جب محنت کرنے والا اپنے آپ کو دوسروں کے لیے اجنبی بنا لیتا ہے۔ جب میرا سارا وقت جس میں دوسروں کے لیے اشیا بنائی جاتی ہیں، تو میرے وجود کی ماہیت اور اصلیت دوسروں کی ملکیت ہو گی۔ اب فرد زرِ مبادلے کے نظام کا مرہونِ منت ہے جس پر اس کا کوئی اختیار نہیں۔ محنت کا یہ غیر انسانی اثر جدید سرمایہ دارانہ نظام میں اپنے عروج تک پہنچ گیا۔ ساتھ ہی غربت اپنے ساتھ لاتعداد مصائب لائی[20]۔

غربت کا نتیجہ اس کی بیوی عائشہ کی موت کی صورت سامنے آیا۔ مناسب علاج نہ ہو سکنے پر وہ موت کی آغوش میں چلی گئی۔ ناول نگار نے علی کا کردار اس طرح پیش کیا ہے کہ یہ کردار اپنی ذات سے بلند ہو کر عمومیت اختیار کر گیا ہے۔ علی کی مغائرت اور تنہائی صرف اس کی ذات تک نہیں رہی بلکہ ہر اس صنعتی مزدور کے کرب کا اظہار بن جاتی ہے جو اس بے مہر اور غیر انسانی نظام کا حصہ ہے۔

جدید سرمایہ دارانہ نظام میں مزدور کے مسائل، ان کی غربت، مالکان کے غیر انسانی رویے، یونین کے نام پر غنڈہ گردی اور استحصال کی موثر اور بھرپور عکاسی الیاس احمد گدی(پ:۱۹۳۴ء) کے ناول فائر ایریا (تازہ ایڈیشن ۲۰۰۴ء) میں ملتی ہے۔ فائر ایریا اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئلے کی کانیں ہوں۔ اس ناول میں کوئلے کی کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں اور ان کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ ناول بنیادی طور پر مارکسی فکر سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے اور اس کا نتیجہ بھی یہی نکالا گیا ہے کہ اشتراکیت ہی درحقیقت وہ نظام ہے جو انسان کے دکھوں، مسائل اور استحصال کا خاتمہ کر سکتا ہے۔

ناول کا مرکزی کردار ''سہدیو' کا تعلق ایک گاؤں سے ہے۔ اس کا بھائی اس نیت پر اسے کوئلوں کی کان پر ملازمت کے لیے بھیجتا ہے کہ وہ پیسے کما کر بھیجے گا اور ہم گاؤں میں اپنی زمین خریدیں گے۔ خان صاحبان کی بیگار اور دھونس سے نجات ملے گی۔ سہدیو کے ذریعے ناول نگار نے کان مزدوروں کے مسائل کو پیش کیا ہے۔ اس ناول میں ہمیں مارکسی مغائرت اور تنہائی کی ایک اور جہت نظر آتی ہے۔ اُداس نسلیں میں کارخانہ جاتی مزدوروں کو پیش کیا گیا ہے جب کہ اس ناول کا موضوع کان مزدور ہیں۔ دونوں ناولوں میں مزدوروں کی حالت ایک جیسی نظر آتی ہے۔ وہی غربت، وہی تنگ دستی، وہی مشینی زندگی، مشینی اوقاتِ کار اور وہی استحصال نظر آتا ہے۔ مزدوروں کی ذہنی حالت اور مغائرت جاننے کے لیے ناول سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> عجیب دنیا تھی یہ، نہ درخت تھے، نہ کھیت تھے، نہ سبزہ تھا اور جو تھا وہ بھی سیاہ دھول سے اٹا پڑا تھا۔ سیاہ مہین دھول.... اب وہ بھی ان ہزارہا افراد میں شامل تھے، جو اپنے جسم کی قوت بیچ کر زندہ رہنے کی جدوجہد میں مصروف تھے ....وہی خواب (رات کو)....پیسہ کمانے کے، زمین خریدنے کے اور گاؤں واپس لوٹ جانے کے.... کھانا ضروری ہے زندہ رہنے کے لیے، کام کرنے کے لیے اور رات کے جھوٹے خوابوں کو سچ بنانے کے لیے[۲۱]۔

مزدوروں کی مغائرت کی حد ملاحظہ ہو کہ سہدیو کے دوست رحمت میاں کو کان میں حادثہ پیش آیا۔ مالکان نے پولیس، یونین اور ورثا کے جھمیلے سے بچنے کے لیے اسے کان کے ہی ایک دور افتادہ حصے میں دبا دیا اور کاغذات میں ظاہر کیا کہ وہ کان سے باہر آیا تھا اور پھر کہیں چلا گیا۔ سہدیو جب چھٹی گزار کر گھر سے واپس آیا تو رحمت میاں کی تلاش شروع کی۔ سب مزدور اصل واقعہ جانتے تھے لیکن کسی نے بھی کچھ نہ بتایا۔ اس ناول میں مغائرت کی وہ صورت نظر نہیں آتی جو اُداس نسلیں میں پیش کی گئی ہے۔ یہاں مغائرت بےحسی کی صورت میں نظر آتی ہے۔ سہدیو اس نظام میں رہتے ہوئے بھی اس مغائرت کا شکار نہیں ہوتا، وہ اپنے وجود کا احساس دلاتا رہتا ہے لیکن مزدور اس کے بجائے مالکان کے ساتھ کھڑے ہوتے

ہیں۔

فائر ایریا میں مغائرت، اُداس نسلیں سے مختلف نظر آتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں مغائرت کی پہلی سطح اس نظام سے، دوسری سطح سماج سے اور اس کی انتہا اپنی ذات سے مغائرت کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ اُداس نسلیں میں علی مغائرت کی آخری سطح پر دکھائی دیتا ہے جہاں وہ اپنی محبت عائشہ،خود اپنی ذات،اپنے وجود سے مغائرت کا شکار ہو جاتا ہے۔ جب کہ فائر ایریا میں مرکزی کردار سہد یو نظام کے اندر رہتے ہوئے اس کو تبدیل کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن دیگر مزدور اس نظام اور سماج سے مغائرت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس ناول میں مغائرت کی آخری سطح نظر نہیں آتی۔ ''سہد یو'' کا کردار مزدوروں میں رہتے ہوئے بھی مزدوروں کا نمائندہ کردار ثابت نہیں ہوتا جب کہ ''علی'' مزدوروں کا نمائندہ کردار بن جاتا ہے۔ کوئی بھی مزدور علی ہوسکتا ہے جب کہ کوئی اور مزدور سہد یو نہیں ہوسکتا۔

اُردو ناول میں مغائرت، تنہائی اور بے گھری کے احساس کی ایک اور سطح ہجرت اور نقل مکانی کے تناظر میں لکھے گئے ناول کی صورت میں سامنے آتی ہے[۲۲]۔ تقسیم ہندوستان کے نتیجے میں دنیا کی سب سے بڑی انسانی ہجرت دیکھنے میں آئی۔ تقسیم ہندوستان کے حامیوں اور تقسیم کنندگان کو بھی اتنی بڑی سطح پر نقل مکانی کی اُمید نہیں تھی۔ لگ بھگ ایک کروڑ افراد نے اپنے گھر بار، زمین جائداد کو چھوڑا اور ہجرت پر مجبور ہوئے۔ تقسیم ہندوستان اور ہجرت کے دوران ظلم، بربریت، قتلِ عام، آبرو ریزی، اغوا کے ایسے مناظر سامنے آئے کہ انسانیت کا سر شرم سے جھک گیا۔ یہ دور تاریخ کا سیاہ ترین باب کہلاتا ہے۔ کوئی خاندان ایسا نہ ہوگا جو اپنے تمام افراد اور اعزہ و اقارب کے ساتھ خیریت سے ہجرت کر گیا ہو۔ دونوں طرف لُٹے پٹے، اُجڑے اور تباہ حال لوگ پہنچے جو پاکستان میں مہاجر اور ہندوستان میں شرنارتھی کہلائے۔

ہجرت کے اثرات دو سطحوں پر ہوئے۔ مہاجرین کی آباد کاری، ان کے معاشی مسائل، گم شدہ افراد کی تلاش ایسے مسائل تھے جن کا سامنا فوری طور پر کرنا پڑا۔ ہجرت کے دوررس اثرات جذباتی، نفسیاتی اور تہذیبی نوعیت کے تھے۔ ہجرت کا عمل صرف اتنا نہ تھا کہ کچھ لوگ ہندوستان سے اُٹھ کر پاکستان چلے آئے اور کچھ لوگ پاکستان سے ہجرت کر کے ہندوستان آباد ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہجرت اپنے ماضی، تہذیبی ورثے، بزرگوں کی قبروں، ذہنی اور جذباتی یادوں اور اپنی جڑوں سے اکھڑنے کا عمل تھا۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ہجرت کے فوری اور مادی مسائل پر تو کسی حد تک کچھ برسوں میں قابو پا لیا گیا لیکن اس کے جذباتی، وجودی اور دور رس اثرات آج تک دیکھنے میں آ رہے ہیں۔ ہجرت کا عمل تو تکلیف دہ تھا ہی لیکن اس وقت اس تکلیف میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا جب ہجرت زدگان کے سارے خواب، نظریات اور تصورات بکھر گئے۔ لوٹ

کھسوٹ، کلیموں کی دوڑ اور بعد کے فسادات نے مہاجرین کو احساسِ زیاں کا شکار کر دیا، ماضی سہانا لگنے لگا۔ اس حوالے سے روبینہ الماس (پ: ۱۹۷۵ء) کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> اپنوں سے بچھڑنے کا عمل فرد کے یہاں جس ناسٹلجیا (nostalgia) کو جنم دیتا ہے، وہ ایک گہرے احساسِ تنہائی کی صورت میں اُبھرتا ہے۔ جلاوطنی کی صورت میں انسان مسلسل مسافرت (جو ابتداً جسمانی اور پھر ذہنی ہوتی ہے) ناسٹلجیا اور تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے اور جب نئی زمین میں بھی پاؤں جمانے کی جگہ نہ ملے تو اس ناسٹلجیا کی شدت میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے[۲۳]۔

اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ہجرت کے تناظر میں لکھے گئے اُردو ناولوں میں شدید قسم کی مغائرت، تنہائی، اجنبیت اور بے گھری کا احساس نظر آتا ہے۔ اُردو ناول میں ہجرت کے تجربے اور بے گھری کے احساس کو بھرپور طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ اِس حوالے سے قرۃ العین حیدر، انتظار حسین (۱۹۲۳ء۔ ۲۰۱۶ء)، خدیجہ مستور (۱۹۲۷ء۔ ۱۹۸۲ء)، عبدالصمد (۱۹۲۶۔۱۹۹۹ء) اور جوگندر پال (۱۹۲۵ء۔ ۲۰۱۶ء) کے ناول بہت اہم ہیں۔ ان ناول نگاروں کے علاوہ بھی کئی ناولوں میں جزوی طور پر ہجرت کے المیے کو پیش کیا گیا ہے۔

انتظار حسین ایسے ناول نگار ہیں جن کے تقریباً تمام ناول ہجرت کے المیے کے گرد گھومتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں ہندوستان کی تقسیم، ہجرت اور اپنی جڑوں سے کٹنے کا عمل نظر آتا ہے۔ ان کے ناول بستی (۱۹۹۹ء) اور تذکرہ (۱۹۸۷ء) ہجرت اور ناسٹلجیا کے حوالے سے بہت اہم ہیں۔ انتظار حسین کے ہاں ہجرت کا تجربہ تہذیبی بحران کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ہجرت کے اس عمل میں جاگیردارانہ نظام سے جڑا طبقہ متاثر ہوا۔ یہ طبقہ اپنی مخصوص فکر، تہذیبی اقداراورطرزِ زندگی کا قائل تھا ۔حرکت، تغیراور تبدیلی کو یہ طبقہ آسانی سے قبول نہیں کر سکتا تھا۔اس نظام کی اپنی اخلاقیات ہے جوروایت پرستی، ماضی پرستی، اسلاف پرستی، اور جمود پسندی سے مرتب ہوتی ہے۔ان لوگوں کو جب گھروں، اپنی روایات، اپنے اجداد کی نشانیوں سے، نیم کے پیڑ سے، کربلا کی زمیں سے لائے ہوئے کفن سے، کوئل کی آواز سے جدا ہونا پڑا جو، ان کے اجتماعی شعور و لاشعور کا اہم جزتھیں۔

انتظار حسین نے بستی میں تقسیم ہندوستان، ہجرت اور اس کے نتیجے میں داخلی شکست و ریخت کو موضوع بنایا ہے۔ ناول کا آغاز بہت متاثر کن ہے۔ قیامِ پاکستان کے ابتدائی دنوں میں لوگوں میں مہر، مروت، اخلاق اور پرانی وضع داری موجود تھی۔ اس لیے انھوں نے آغاز میں ایک دوسرے کو کھلے دل سے قبول کیا۔لیکن جلد ہی مادیت پرستی، زمین، املاک، پرمٹ (permit) کے لالچ نے وضع داری اور مروت کو پیچھے دھکیل دیا۔ جائدادوں کی لوٹ کھسوٹ اور ہیرا پھیری عروج پر تھی۔ مذہبی، لسانی اور گروہی لڑائیاں شروع ہوگئیں۔ اس لیے بستی کے مرکزی کردار ذاکر (تاریخ کا پروفیسر) پر مغائرت، تنہائی، داخلیت

اور ناسٹلجیا کا رنگ گہرا نظر آتا ہے۔ ذاکر اور اس کے والدین یوپی کی ایک بستی ''روپ نگر'' سے ہجرت کر کے لاہور آ گئے لیکن روپ نگر سے جذباتی وابستگی ختم نہ ہو سکی۔ بستی کے سبھی کردار ہجرت زدہ اور ماضی کے منظر سے جڑے ہیں۔ وہ بار بار یادوں میں کھو جاتے ہیں۔ ہزاروں برس پر محیط ہند اسلامی تہذیب کی وضع داری، انسان پرستی اور مذہبی رواداری پر قائم تہذیب سے کٹ کر جب ''بستی'' کے لوگ پاکستان پہنچے تو زندگی کا منظرنامہ ہی کچھ اور دیکھا۔

> لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ اس نے سنجیدگی سے سوچا۔ گھروں میں، دفتروں میں، رستورانوں میں، گلیوں بازاروں میں سب جگہ ایک ہی نقشہ ہے۔ بحث پہلے نظریاتی، پھر ذاتی، پھر تو تکار، پھر گالم گلوچ، پھر سر پھٹول____ راہ چلتے لوگوں کا ٹھٹک کر کھڑے ہو جانا، لڑنے والوں کو دہشت سے تکنا، پھر ایک دوسرے سے پوچھنا یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟[۲۴]

حال کی وحشت انھیں مغائرت کا شکار کرتی ہے اور وہ ماضی میں جذباتی پناہ تلاش کرتے ہیں۔ ناول میں المیہ اس وقت وجود میں آتا ہے جب پچیس برس بعد اچانک ذاکر کی ماں کو آبائی نشانیاں، جہیز کا سامان، کربلا سے آیا ہوا کفن اور اس نوع کی اشیا یاد آتی ہیں جنھیں وہ ہجرت کے وقت ایک کمرے میں مقفل کرائی تھیں۔ وہ اِس کوٹھڑی کی چابی تلاش کرنا شروع کرتی ہیں تا کہ ان چیزوں کو جا کر دھوپ لگوائی جائے۔

> اجی زمانے کا کیا ہے، وہ تو گزرتا ہی رہتا ہے مگر کوٹھڑی کی چابی کھو گئی تو غضب ہو جائے گا۔ ہماری تو جدی پشتی چیزیں اسی میں بند ہیں۔ میرا سارا جہیز کا سامان اسی میں ہے...... بار بار تم سے کہا کہ پاکستان چلنے سے پہلے روپ نگر کا ایک پھیرا لگا آؤں..... ارے میں ایک مرتبہ تالا کھول کے چیزوں کو کم سے کم دھوپ تو لگا آتی۔ اتنا زمانہ ہو گیا کم بخت دیمک نہ لگ گئی ہو، اس گھر میں دیمک بہت تھی[۲۵]۔

بستی کے کرداروں کی مغائرت، ماضی پرستی، تہذیب سے کٹنے کا نوحہ اس نوع کی کیفیات کو مدِنظر رکھتے ہوئے بستی کو ہندوستان کے تارکینِ وطن کا نوحہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ سقوطِ ڈھاکا (۲۶ مارچ ۱۹۷۱ء۔۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء) نے مرکزی کردار ذاکر کے اندر ہجرت کی لاحاصلی کا کرب گہرا کر دیا۔ اس پر مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا اثر ہے جس کے نتیجے میں لاتعداد بے گناہ افراد مارے گئے۔ اس پر پاک بھارت جنگ کا بھی اثر ہے۔ ذاکر امن و آشتی کا خواہاں ہے وہ ''روپ نگر'' اور ''بستی'' دونوں کی سلامتی کا آرزو مند ہے۔

تقسیم ہندوستان، ہجرت اور سقوطِ ڈھاکا کے حوالے سے عبدالصمد کا ناول دو گز زمین (۱۹۹۳ء) بھی بہت اہم ناول ہے۔ انتظار حسین کے ناول تذکرہ سے پہلے دو گز زمین کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ دونوں ناولوں میں کسی حد تک سقوطِ

ڈھاکہ اور اس کے اثرات کا حوالہ موجود ہے۔ دو گز زمین اس حوالے سے بھی بہت اہم ناول ہے کہ قیامِ پاکستان کے ساتھ مسلمانوں کی بڑی تعداد ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان چلی آئی۔ ہندوستان میں بچ جانے والے مسلمانوں کو ہندوؤں کے ظلم، قتل و غارت اور تنفر کا سامنا کرنا پڑا۔ انھیں غدار اور پاکستانی کہا گیا۔ وہ اپنے گھر، اپنی زمین پر رہتے ہوئے تنہائی اور مغائرت اور بے گھری کا شکار ہوئے۔ ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کی سماجی حیثیت کے حوالے سے کچھ حقائق قرۃ العین حیدر کے ناول آگ کا دریا (۱۹۸۹ء) اور خدیجہ مستور کے ناول آنگن (جنوری ۱۹۸۴ء) میں بھی موجود ہیں۔ یہاں ان کا بھی تقابل کیا جائے گا۔

دو گز زمین زمین کا زمانی دورانیہ ساٹھ برس کو محیط ہے۔ شیخ الطاف حسین کا تعلق بہار شریف کے ایک گاؤں ''بین'' سے ہے۔ شیخ صاحب کی اولاد میں چار بیٹے اور چار بیٹیاں ہوئیں۔ انگریزوں سے آزادی کی سیاسی مصروفیات کی وجہ سے پٹنہ شہر میں آباد ہوئے۔ شیخ صاحب کے داماد اختر حسین کا کردار اس ناول میں بنیادی نوعیت کا ہے۔ شیخ الطاف کی وفات کے بعد انھوں نے ہی زمین داری سنبھالی، گھر کا انتظام سنبھالا اور وکالت کے ساتھ ساتھ سیاسی طور پر بہت سرگرم رہے۔ اختر حسین کانگریس کے ضلعی صدر مقرر ہوئے۔ شیخ الطاف حسین کے بڑے بیٹے سرور حسن کو سیاست سے دل چسپی نہ تھی۔ اصغر حسین نے مسلم لیگ میں شمولت اختیار کی، یوں یہ گھرانا دو انتہاؤں کا شکار ہو گیا۔ اختر حسین نے گھر میں رہائش ترک کر دی اور باہر اپنے بنگلے پر رہنے لگے۔ کانگریس کا دفتر الگ عمارت میں تھا۔ آئے دن ملاقاتیں ہوتی رہتیں۔ پولیس کے چھاپے بھی پڑتے رہتے۔ اختر حسین اکثر جیل جاتے رہتے تھے اِن کا ایک سوٹ کیس جیل میں کام آنے والے ضروری سامان سے بھرا رہتا۔

الیکشن (elections) ہوئے مسلم لیگی اُمیدوار جیت گئے۔ اس سیاسی گہما گہمی کا سماجی زندگی پر گہرا اثر ہوا۔ ہر طرف مذہبی تعصب کے رنگ ابھرنے لگے، جس نے لوگوں کے دلوں میں نفرت کے بیج بوئے، سارے علاقے کی فضا مسموم ہو گئی۔ خاندان کے افراد پاکستان اور ہندوستان کے نام پر تقسیم ہو گئے۔ شناخت کا معیار مذہب بن گیا۔ یہ مذہبی امتیازات گہرے تعلقات کے درمیان ان دیکھی خلیج بن کر کھڑے ہو گئے اور یہ خلیج وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔ یہاں مذہب کی بنیاد پر تقسیم نے اس نفرت کی بنیاد رکھی جو تقسیم ہندوستان کے وقت فسادات کی صورت سامنے آئی۔ ہندوستان آزاد ہو گیا لیکن اس سے ایک دن پہلے پاکستان بن گیا۔ کانگریس کے مسلمان کارکن سخت مایوس ہوئے کہ پاکستان کی مخالفت کر کے اپنوں کی گالیاں سنیں اور پاکستان بھی بن گیا۔ کانگریس کے یہی کارکن بعد میں اپنی پارٹی کے ہندو رہنماؤں اور عوامی سطح پر متعصّبانہ

رویوں کا شکار ہو کر شدید مغائرت ،تنہائی اور لاحاصلی کا شکار ہوئے۔ اصغر حسین نے اپنی ساری جائدا د بیچ دی اور پاکستان ہجرت کر لی۔ بعد میں ان کے بڑے بھائی سرور حسین بھی پاکستان آ گئے۔ یوں یہ گھرانا آدھا پاکستان اور آدھا ہندوستان میں بٹ گیا۔ جو لوگ پاکستان چلے آئے وہ تو آ گئے جو پیچھے رہ گئے، وہ اس وقت شدید مسائل کا شکار ہوئے کہ ان کی جائدادوں اور گھروں کو کسٹوڈین (custodian) کے محکمے نے قبضے میں لے لیا۔

> کسی خاندان کا ایک بھی فرد اگر پاکستان چلا آیا تو اس گھرانے اور خاندان کے وارثوں کی موجودگی کے باوجود اس کو متروکہ املاک قرار دے دیا گیا۔مسلمان ہونا اور کسی ایک رشتے دار کا پاکستان چلے جانا،ایسی کمزوری تھی جس کا خوب فائدہ اٹھایا گیا[۲۶]۔

اختر حسین اصول پرست آدمی تھے۔انھوں نے نائب وزیر ہونے کے باوجود بیٹے حامد کی سفارش نہ کی۔ حامد کو مسلمان ہونے اور سفارش کے نہ ہونے کی وجہ سے ملازمت نہ ملی تو وہ ڈھاکا چلا گیا۔ وہاں اسے خاصی اچھی ملازمت مل گئی، اچھے لوگوں میں شادی کر لی اور آسودہ زندگی گزارنے لگا کہ سابقہ مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) میں شورش برپا ہوئی۔ آزادی کے نعرے لگنے لگے۔ یہاں سے ناول ایک اور المیہ کروٹ لیتا ہے۔ ہندوستان سے جو لوگ ہجرت کر کے مشرقی پاکستان گئے تھے، ان کے لیے کہیں کوئی جائے امان نہ رہی۔ نہ تو وہ واپس ہندوستان جانے کے قابل رہے کیوں کہ حکومتی سطح پر ایسے لوگوں کو قید کر لیا جاتا اور دوسرا ان کے خاندان کے افراد بھی انھیں قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے کیوں کہ وہ جائداد میں شراکت برداشت نہ کرتے تھے۔ بنگالی اور بہاری کی تقسیم سامنے آئی۔ ناول میں ہجرت در ہجرت کے المیے کو پیش کیا گیا ہے۔ کچھ آسودہ حال بہاری نیپال کے راستے پاکستان ہجرت کر آئے، ان میں حامد بھی شامل تھا، اور جو ہجرت کر کے مغربی پاکستان (موجودہ پاکستان) نہ آ سکے، ان کی سماجی زندگی اور مقام بہت پست ہے۔ آج بھی وہ لوگ بنگلہ دیش میں بنیادی حقوق سے محروم ہیں۔ ناول کا اختتام بہت تکلیف دہ ہے۔ حامد اور اس کی بنگالی بیوی نازیہ لٹ لٹا کر نیپال کے راستے پاکستان پہنچے تو اصغر حسین اور اس کے گھرانے میں ان کے لیے کوئی ہم دردی یا سہارے کی گنجائش نہ نکلی۔ مادیت پرستی نے رشتوں کی محبت اور انسانی اقدار کو چاٹ لیا تھا۔یہ آزادی کے ڈرامے کے کلائمکس (climax) کے بعد وہ اینٹی کلائمکس (anticlimax) ہے جس کے اندر کروڑوں لوگ سانس لے رہے ہیں۔

ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کی کچھ جھلکیاں خدیجہ مستور کے ناول آنگن میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ ہجرت اور اپنی جڑوں سے کٹنے کے نتیجے میں مغائرت اور تنہائی عالیہ کا نصیب ٹھہری اور بڑے چچا جو کانگریس کے سرگرم اور سرکردہ رہ نماؤں میں تھے، انھیں کسی ہندو نے صرف مسلمان ہونے کے 'جرم' میں قتل کر دیا۔

مظہر عباس

> ارے تم کو کیا ہوا ہے؟ اماں اس کے سرخ چہرے اور سوجی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر گھبرا گئی تھیں۔ بڑے چچا کو کسی ہندو نے چھکے سے مار دیا۔ اس نے بڑے سکون سے کہا۔ اتنا رو چکنے کے بعد اسے جیسے صبر آ گیا تھا۔ ہے، ہے ساری زندگی ہندو کی غلامی کرنے بعد یہ بدلہ مِلا؟ اماں کی آواز بھرا رہی تھی۔ انھوں نے پلو میں آنسو خشک کر لیے[۲۷]۔

قیامِ پاکستان کے بعد ہجرت کرنے والوں کے عزیز و اقارب پر ہندوستان میں کیا بیتی، وہ کس طرح اپنی زمین، اپنے ملک اور اپنے ہی گھروں میں رہتے ہوئے بے گھری کے احساس کا شکار ہوئے، ان کی املاک اور گھروں کو متروکہ قرار دے دیا گیا اور سابقہ مشرقی پاکستان ہجرت کر جانے اور وہاں کی شہریت اختیار کرنے والے مہاجرین پر ۱۹۷۱ء میں غیر بنگالی ہونے کے نام پر جو مصائب نازل ہوئے، کس طرح مغائرت، تنہائی اور بے گھری کے احساس کا شکار ہوئے، پاکستان میں دولت کی لوٹ کھسوٹ، بے جا دولت کی نمائش اور افراتفری نے کس طرح مہاجرین کو بے گھری کے احساس کا شکار کیا، اس کی گہری جھلکیاں قرۃ العین حیدر کے ناول چاندنی بیگم (۱۹۹۰ء) میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ چاندنی بیگم کے والد قیامِ پاکستان کے ساتھ ہجرت کر کے کراچی چلے آئے۔ چاندنی بیگم کی والدہ پڑھی لکھی تھیں سو انھوں نے پرائیویٹ سکول میں ملازمت کر کے بیٹی کو پڑھایا لکھایا۔ ماں کی وفات کے بعد چاندنی بیگم کو گھریلو ملازمہ کے طور پر کام کرنا پڑتا ہے۔

> اچانک سین بدلا۔ تعلقہ داران و بیگمات مع کاروں، پالکیوں اور بگھیوں کے غائب۔ بہت جلد تانگے اور یکے بھی معدوم ہو گئے۔ سائیکلوں اور رکشاؤں کا سیلاب اُمڈ آیا۔ ان پر سوار ایسے موکل بستے تھامے برساتی میں داخل ہوئے جن کی املاک کسی ایک عزیز کی پاکستان روانگی کے سبب متروکہ قرار دے دی گئی تھیں[۲۸]۔

بنگلہ دیش کے قیام کے بعد ہندوستان سے ہجرت کر کے سابقہ مشرقی پاکستان جا بسنے والوں پر کیا گزری، کس طرح مغائرت اور بے گھری کے احساس کا شکار ہوئے۔ اس کی جھلک چاندنی بیگم میں دکھائی گئی ہے۔ لکھنو سے تعلق رکھنے والے شیخ طاہر اور ان کا بھائی مظہر علی بنگال پہنچے۔ بہت بڑا کاروبار کھڑا کیا۔ شیخ طاہر علی کا کاروبار آسام میں گورکھا گوریلوں کے ہاتھ تباہ ہوا اور بنگلہ دیش کی تحریکِ آزادی کے دوران ان کے چھوٹے بھائی کو قتل اور ان کی بیٹیوں کو اغوا کر لیا گیا۔ ان کا جرم اتنا تھا کہ وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ غیر بنگالی تھے اور بہاری مہاجر کہلاتے تھے۔ ان تمام الم ناک سانحات نے شیخ طاہر علی کو شدید مغائرت، تنہائی اور بے گھری کے احساس میں مبتلا کر دیا۔ ان کی کیفیت کے حوالے سے اقتباس ملاحظہ ہوں:

> سنو ارشد میاں، ہاتھی کی آنکھ سے ایک مُنا سا آنسو ٹپکا۔ میرا چھوٹا بھائی مظہر علی اپنی مکمل بربادی کے بعد جا بجا

دھکے کھاتا پھرا۔ تین ملک بن گئے۔ ایک پرانا، دو نئے۔ پھر بھی لوگوں کو چین نہیں۔ قرار نہیں۔ سکون نہیں۔
مارے مارے پھرتے ہیں۔ مارے جاتے ہیں۔ زمین گھوم گئی[۲۹]

شیخ طاہر علی اِس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انھیں اپنے آبائی گاؤں کو چھوڑ کر آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہمیں اپنے آبائی گاؤں ہی سے نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ لاحاصلی کا یہ تجربہ سماجی سطح پر مغائرت میں ڈھل جاتا ہے۔ انھی کیفیات کا شکار تذکرہ کے کردار نظر آتے ہیں۔ انتظار حسین کا یہ ناول ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا اور فنی حوالے سے اسے بستی سے بہتر قرار دیا گیا۔انتظار حسین کے ناولوں میں مغائرت اور تنہائی کے حوالے ایک اقتباس :

> ''مغائرت اور فرد کی تنہائی انتظار حسین کے ناولوں کی دوسری اہم خصوصیت ہے۔ انسان اپنی دنیا سے کٹ گیا ہے۔ اپنے معاشرے سے کٹ گیا ہے اور اپنے آپ سے بھی کٹ گیا ہے۔یعنی اعتماد کلی طور پر اُٹھ گیا ہے۔ .... دنیا سے، گردوپیش سے، اپنے آپ سے[۳۰].......

تذکرہ کا مرکزی کردار اخلاق ہجرت کے بعد اپنی ماں ''بوجان'' کو ساتھ لیے لاہور میں ایسے مناسب گھر کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے جو بوجان کو ماضی کی یادوں کے ساتھ جوڑ دے۔''بوجان'' لاہور آ کر بھی ''چراغ حویلی'' سے جڑی ہیں۔ جہاں ان کی زندگی کی اچھی بری سب یادیں دفن ہیں۔ بار بار مکان تبدیل کرنے کے باوجود بوجان کی جذباتی تشنگی برقرار رہتی ہے اور کسی گھر میں بھی انھیں قرار نہیں آتا۔ یہاں تک کہ ''اخلاق'' قرضہ لے کر ایک گھر بناتا ہے اور اس کا نام ''آشیانہ'' رکھتا ہے۔لیکن آشیانہ، چراغ حویلی کا نعم البدل ثابت نہ ہوسکا۔ ہو بھی نہیں سکتا تھا کیوں کہ گھر صرف چار دیواری سے نہیں بلکہ یادوں، محبتوں اور جذباتی وابستگی کے ساتھ بنتے ہیں۔ ان کی جذباتی وابستگی تو ''چراغ حویلی'' کے ساتھ تھی اس لیے آخری دنوں میں زیادہ یاد آنے لگی۔خوابوں میں اسے دیکھنے لگیں۔

> پرسوں رات کی بات ہے۔ دیکھا کہ جیسے رات کا وقت ہے۔ حویلی کا بڑا پھاٹک بھاڑ کھلا ہوا۔ اندر اندھیرا۔ میں حیران ہو کے کہہ رہی ہوں کہ نہ جانے کیا بات ہے کہ آج حویلی کا پھاٹک کھلا پڑا ہے اور ڈیوڑھی میں لالٹین بھی نہیں جل رہی۔ اندر سے دل دھکڑ پکڑ کرے کہ اندر جاؤں یا نہ جاؤں۔ پھر جیسے حویلی میں اکیلی بھٹک رہی ہوں۔ چلا رہی ہوں کہ اری او سکینہ، تو کہاں مر گئی۔ چولھا ٹھنڈا پڑا ہے۔ باورچی خانے میں جھاڑو بھی نہیں لگی ہے۔ کب ہنڈیا چڑھائے گی، کب کھانا پکے گا۔ اے لو، ابھی میں سکینہ کو آواز دے ہی رہی ہوں کہ میری آنکھ کھل گئی..... پھر چپ۔گم سم۔ اپنے خیالوں میں غرق۔ یہ بوجان کی آخری گفتگو تھی[۳۱]۔

اخلاق، بستی کے مرکزی کردار ''ذاکر'' ہی کا روپ نظر آتا ہے۔ اس میں اخلاق کی طرح سنجیدگی، متانت، وقار

اور تفکر کا رنگ گہرا ہے۔ بستی کی 'بی اماں' اور ''امی''، تذکرہ کی ''بوجان'' اور دو گز زمین کی '' بی بی صاحبہ'' کے کرداروں میں بہت حد تک مماثلت نظر آتی ہے۔ یہ ایسے کردار ہیں جن کی جڑیں اپنی تہذیب، اپنے خاندان اور اپنے ماضی میں اِس حد تک اُتری ہوئی ہیں کہ یہ کسی نئی جگہ آباد ہو ہی نہیں سکتے۔ انھیں مسلم لیگ، کانگریس، ہندوستان اور پاکستان سے کوئی غرض نہیں، انھیں تو اپنا گھر، اپنے رشتے، اپنی روایات اور اپنے ماضی سے غرض ہے۔

انتظار حسین کا ناول آگے سمندر ہے (۱۹۹۵ء) اور جوگندر پال کا ناول خواب رو (۱۹۹۱ء) میں بھی ہجرت اور اس کے نتیجے میں سیاسی، سماجی، تہذیبی اور جذباتی مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ دونوں ناول، کراچی کے تناظر میں لکھے گئے ہیں۔ انتظار حسین نے پاکستان میں بیٹھ کر کراچی کے مہاجرین کے مسائل کو پیش کیا ہے اور جوگندر پال نے ہندوستان میں بیٹھ کر کراچی کے مہاجرین کی تصویر کشی کی ہے۔ انتظار حسین کے اس ناول کا مزاج پہلے والے ناولوں سے نسبتاً مختلف ہے۔ ہجرت کا دُکھ، مغائرت اور تنہائی کا احساس بھی نسبتاً کم ہے۔ اس ناول کا عنوان گہرے علامتی مفاہیم کا حامل ہے کہ ہجرت کا دکھ، اپنے ماضی اور جڑوں سے کٹنے کا عمل اپنی جگہ لیکن اَب یہی ہمارا وطن ہے۔ یہی ہمارا گھر ہے، اب اور کوئی ہجرت منطقی، جذباتی اور وجودی سطح پر ممکن نہیں، کیوں کہ آگے سمندر ہے۔ قیام پاکستان کو نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا۔ مہاجرین آج بھی اپنے آبائی گھر، گاؤں، دوست احباب کی یادوں کو تازہ کر کے افسردگی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہجرت کے نتیجے میں بے گھری اور ناسٹلجیا ایک فطری اَمر ہے۔ لیکن ان لوگوں کے کرب کا اندازہ کریں جو ماضی کی یاد سے بندھے، اپنے ماضی سے ملنے انڈیا چلے گئے، بدلے ہوئے حالات میں انھیں اپنا بچپن یا ماضی نہیں ملا بلکہ اجنبیت کا شدید احساس ہوا۔ یہی ناول کے مرکزی کردار جواد کے ساتھ ہوا۔

> میں تو اپنے حساب سے سیدھا دلکشا گیا تھا۔ وہاں کچھ بچا ہی نہیں۔ بس ایک عمارت کا ملبہ پڑا تھا۔ بس ایک دم سے میرے ذہن میں چٹیل میدان بن گیا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ دلکشا کو اس کے مکینوں، اس کے درختوں پرندوں کے ساتھ تصور میں لاؤں مگر میرا تصور مجھے جواب دے گیا[۳۲]۔

ہندوستان کے سیاسی، سماجی حالات، نیا ماحول، نئی نسل، خاندانی حالات، رشتے داروں کے طعنے، وہ جلد ہی گھبرا کر واپس کراچی آجاتا ہے۔ آگے سمندر ہے میں ابن حبیب کے سوال پر عبداللہ کا یہ جواب بہت معنی خیز ہے:

> میں اگر جانتا ہوں تو بس اتنا کہ ایک وقت کشتیاں جلانے کا ہوتا ہے اور ایک وقت کشتی بنانے کا۔ وہ وقت بہت پیچھے رہ گیا جب ہم سے اگلوں نے ساحل پر اُتر کر سمندر کی طرف پشت کر لی تھی اور اپنی ساری کشتیاں جلا ڈالی تھیں۔ اب بپھرتا سمندر ہمارے پیچھے نہیں، ہمارے سامنے ہے اور ہم نے کوئی کشتی نہیں بنائی ہے[۳۳]۔

اجنبیت، بے گانگی، مغائرت، تنہائی اور بے گھری کے احساس کی ایک اور طرح سے ترجمانی جوگندر پال نے

''خواب رو'' میں کی ہے۔ نواب مرزا کمال الدین لکھنو سے ہجرت کر کے پاکستان آئے اور کراچی میں آباد ہوئے۔ ان کی عادت تھی کہ کہیں بھی جاتے، جب تک لکھنو واپس نہ آجاتے، انھیں قرار نہ آتا۔ کراچی آئے تو ان کی ذہنی کیفیت ایسی ہو گئی کہ انھوں نے اپنا لکھنو یہیں منگوالیا۔ وہ کراچی کو ہی لکھنو سمجھنے لگے۔ اسی لیے ان کی بیگم نے انھیں دیوانے مولوی صاحب کہنا شروع کیا اور اسی نام سے معروف ہو گئے۔ اگر کوئی لکھنو کا ذکر کرتا تو دیوانے مولوی صاحب اسے دیوانہ کہتے کہ لکھنو میں رہتے ہوئے لکھنو کو یاد کر رہے ہیں۔ناول میں اَلمیہ نے اس وقت جنم لیا جب سندھی، مہاجر فسادات کے نتیجے میں دیوانے مولوی صاحب کا گھر بارود سے اُڑا دیا گیا۔ اچھی بیگم، نواب مرزا (بیٹا) چاندنی بی بی (بہو)، ثری (پوتی) اس حادثے میں جاں بحق ہوئے۔ دیوانے مولوی صاحب نے اس زمین، اس وطن کو اپنا سب کچھ مان لیا تھا۔ اپنا تصوراتی لکھنو یہیں آباد کر لیا تھا۔وہ یکدم اجنبیت، بے گانگی، مغائرت اور بے گھری کے شدید احساس میں گھر گئے۔ وہ سمجھنے لگے کہ ابھی ابھی لکھنؤ سے کراچی آئے ہیں اور اب انھیں واپس ''اپنے گھر'' لوٹ جانا چاہیے۔ یہاں ایک حقیقت یہ بھی سامنے آتی ہیں کہ مہاجرین کے احساسِ مغائرت اور بے گھری کے احساسات کے پیچھے پاکستان کے سماجی حالات نے بھی بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ مہاجرین اگر ابھی تک جذباتی سطح پر اپنی جڑیں مضبوط نہیں کر سکے تو یہاں کے مقامی افراد نے بھی انھیں مہاجر ہی کی نظر سے دیکھا ہے۔

> پوری طرح ہوش بحال ہوتے ہی دیوانے مولوی صاحب کو پتا چل گیا کہ وہ لکھنؤ کے بجائے کراچی میں ہیں۔ یعنی اس وقت سے کراچی میں ہیں جب سے ان کے ہوش بحال ہوئے ہیں، لیکن اب ان کا پاگل پن یوں شروع ہو گیا ہے کہ وہ نہایت معصومیت سے سمجھتے ہیں، وہ سارا عرصہ فی الحقیقت لکھنؤ میں ہی مقیم تھے اور انھی دنوں وہاں سے چند روز کے لیے کراچی آئے ہیں[۳۴]۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دیوانے مولوی صاحب پہلے دیوانے تھے یا اب ہوئے ہیں؟ پہلے ہوش میں تھے تو کیا اب دیوانے ہوئے ہیں؟اگر دیوانے مولوی 'دیوانے' ہیں تو' ہوش مند' کون ہے؟ دیوانے مولوی صاحب بھی اسی کیفیت کا شکار نظر آتے ہیں جس کیفیت کا شکار چاندنی بیگم میں شیخ طاہر علی ہوتے ہیں۔ دونوں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انھیں اپنے گھر سے ہی نہیں نکلنا چاہیے تھا۔تقسیمِ ہنداور ہجرت کا المیہ اردو ناول کی تاریخ میں اتنا بڑا موڑ ثابت ہوا جس کے اثرت آج تک قائم ہیں۔تقسیم اور ہجرت کے اس تجربے نے اجتماعی تہذیبی ورثے کو چھین لیا،صدیوں سے قائم ہنداسلامی تہذیب کی وضع داری اور اجتماعیت پر کاری ضرب لگائی۔فرد نے اپنے خارج سے فرار حاصل کرنے کے لیے اپنے داخل کی دنیا میں پناہ حاصل کی۔تقسیم کے المیے کے ثمرات کی صورت میں تنہائی،فراریت، اکتاہٹ، رنجیدگی اور فراری رویوں نے اُردو ناول میں فروغ پایا۔

۱۴۲ مظہر عباس

حواشی و حوالہ جات

* (پ: ۱۹۷۴ء) اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو و اقبالیات، دی اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور۔

۱۔ جابر علی سید، استعارے کے چار شہر (ملتان: بیکن بکس، ۱۹۹۴ء)، ۷۵۔

۲۔ سی۔اے۔قادر، ''وجودیت''، مشمولہ ادب، فلسفہ اور وجودیت، مرتبہ شیما مجید/ نعیم الحسین (لاہور: نگارشات، ۱۹۹۲ء)، ۷۸۲۔

۳۔ فرید الدین، ''وجودیت کے اہم موضوعات''، مشمولہ وجودیت، مرتبہ جاوید اقبال ندیم (لاہور: وکٹری بک بینک، ۲۰۰۹ء)، ۳۶۔

۴۔ ابنِ حسن، ''ادب اور معروضی حقیقت ـــــ مارکس کا فلسفۂ بعد''، مشمولہ انگارے نمبر ۱۷ (ملتان: مئی ۲۰۰۴ء)، ۲۹۔

۵۔ ایضاً، ۲۷

۶۔ قرۃ العین حیدر، میرے بھی صنم خانے (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء)، ۱۶۔

۷۔ ایضاً، ۲۴۳-۲۴۲۔

۸۔ قرۃ العین حیدر، سفینۂ غمِ دل (لاہور: مکتبۂ جدید، لاہور، بار اوّل، ۱۹۵۲ء)، ۳۷۴۔

۹۔ ایضاً، ۳۷۵۔

۱۰۔ قرۃ العین حیدر، مجموعہ پکچر گیلری (لاہور: قوسین، ۱۹۸۳ء)، ۱۳۔

۱۲۔ عبداللہ حسین، باگھ (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء)، ۱۶۱۔

۱۳۔ محمد احسن فاروقی، نور الحسن ہاشمی، ناول کیا ہے (لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۲ء،)، ۴۶۔

۱۴۔ انیس ناگی، دیوار کے پیچھے (لاہور: فیروز سنز، ۱۹۸۸ء)، ۱۸۵۔

۱۵۔ انیس ناگی، میں اور وہ (لاہور: مکتبہ جمالیات، ۱۹۸۴ء)، ۳۶۔

۱۶۔ انیس ناگی، ''چوہوں کی کہانی''، مشمولہ فصیلیں (لاہور: جمالیات، ۲۰۰۵ء)، ۲۱۸۔

۱۷۔ انیس ناگی، ''کیمپ''، مشمولہ فصیلیں، ۳۳۷۔

۱۷۔ مشرف عالم ذوقی، پوکے مان کی دنیا (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۴ء)، ۲۸۔

۱۸۔ عبداللہ حسین، اُداس نسلیں (لاہور: قوسین، ۱۹۸۴ء)، ۳۹۹۔

۱۹۔ ایضاً، ۴۱۱۔

۲۰۔ ابنِ حسن، ''ادب اور معروضی حقیقت ـــــ مارکس کا فلسفۂ بعد''، مشمولہ انگارے، ۴۳۔

۲۱۔ الیاس احمد گدی، فائر ایریا (دہلی: بک کارپوریشن، ۲۰۰۴ء)، ۱۷-۱۶۔

۲۲ یہاں ایک بات یاد رکھی جائے کہ ہمیں ہجرت اور اس کے نتیجے میں ہندوستان اور پاکستان میں مہاجرین کی سماجی، نفسیاتی اور جذباتی کیفیات کا جائزہ اُردو ناول کے تناظر میں لینا مقصود ہے، اس لیے یہاں براہِ راست فسادات کو موضوع نہیں بنایا گیا۔

۲۳۔ روبینہ الماس، اُردو افسانے میں جلاوطنی کا اظہار (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء)، ۱۴۲۔

۲۴۔ انتظار حسین، بستی (لاہور: نقشِ اوّل کتاب گھر، ۱۳۹۹ھ)، ۳۸۔

۲۵۔ ایضاً، ۱۳۶۔

۲۶۔ عبدالصمد، دو گز زمین (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۲ء)، ۵۹۔

۲۷۔ خدیجہ مستور، آنگن (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، جنوری ۱۹۸۴ء)، ۲۹۴۔

۲۸۔ قرۃ العین حیدر، چاندنی بیگم (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء)، ۱۰-۹۔

۲۹۔ ایضاً، ۳۷۰۔

۳۰۔ رضی عابدی، تین ناول نگار، ۷۵۔

۳۱۔ انتظار حسین، تذکرہ (لاہور: سنگِ میل، ۱۹۸۷ء)، ۲۲۷-۲۲۶۔

۳۲۔ انتظار حسین، آگے سمندر ہے (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء)، ۱۳۳۔

۳۳۔ ایضاً، ۳۰۸۔

۳۴۔ جوگندر پال، خواب رو (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۱ء)، ۱۰۲۔

مآخذ

ابنِ حسن۔ ''ادب اور معروضی حقیقت ـــــ مارکس کا فلسفۂ بعد''۔ مشمولہ انگارے نمبر ۱۷۔ ملتان: مئی ۲۰۰۴ء۔

انتظار حسین۔ آگے سمندر ہے۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء۔

ـــــ۔ بستی۔ لاہور: نقشِ اوّل کتاب گھر، ۱۳۹۹ھ۔

ـــــ۔ تذکرہ، لاہور: سنگِ میل، ۱۹۸۷ء۔

انیس ناگی۔ دیوار کے پیچھے۔ لاہور: فیروز سنز، ۱۹۸۸ء۔

ـــــ۔ فصیلیں۔ لاہور: جمالیات، ۲۰۰۵ء۔

ـــــ۔ میں اور وہ۔ لاہور: مکتبہ جمالیات، ۱۹۸۴ء۔

بٹ، محمد افضال۔ اُردو ناول میں سماجی شعور۔ اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۹ء۔

جابر علی، سید۔ استعارے کے چار شہر۔ ملتان: بیکن بکس، ۱۹۹۴ء۔

جوگندر پال۔ خواب رو۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۱ء۔

خان، ممتاز احمد۔ آزادی کے بعد اُردو ناول۔ لاہور: قوسین، ۱۹۸۴ء۔

ـــــ۔ اُردو ناول کے چند اہم زاویے۔ کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۲۰۰۳ء۔

ذوقی، مشرف عالم۔ پو کے مان کی دنیا۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۴ء۔

رضی عابدی۔ تین ناول نگار۔ لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء۔

روبینہ الماس۔ اُردو افسانے میں جلاوطنی کا اظہار۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء۔

شاہین مفتی۔ انیس ناگی اُردو ادب کا اینٹی ہیرو۔ لاہور: حسن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء۔

شیما مجید/ نعیم الحسین۔ مرتبین۔ ادب، فلسفہ اور وجودیت۔ لاہور: نگارشات، ۱۹۹۲ء۔

عبدالصمد۔ دو گز زمین۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۲ء۔

عبداللہ حسین۔ اُداس نسلیں۔ لاہور: قوسین، ۱۹۸۴ء۔

ـــــ۔ باگھ۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء۔

فاروقی، محمد احسن / نور الحسن ہاشمی، ناول کیا ہے۔ لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۲ء۔

فرید الدین۔ ''وجودیت کے اہم موضوعات''۔ مشمولہ وجودیت، مرتبہ جاوید اقبال ندیم۔ لاہور۔ وکٹری بک بینک، ۲۰۰۹ء۔

قرۃ العین حیدر۔ چاندنی بیگم۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء۔
______۔ سفینۂ غمِ دل۔ لاہور: مکتبۂ جدید، ۱۹۵۲ء۔
______۔ مجموعہ پکچر گیلری۔ لاہور: قوسین، ۱۹۸۳ء۔
______۔ میرے بھی صنم خانے۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء۔
گدی، الیاس احمد۔ فائر ایریا۔ دہلی: بک کارپوریشن، ۲۰۰۴ء۔
خدیجہ مستور۔ آنگن۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، جنوری ۱۹۸۴ء۔